# نصابِ اُردو

برائے

## امتحان انٹرمیڈیٹ

اُن طلبہ کے لئے جن کی مادری زبان اُردو نہیں ہے

مرتّبہ

ادارۂ اُردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

باہتمام محمد مقتدیٰ خان شروانی

مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں طبع ہوا

١٣٤٩ھ ١٩٣١ء

URDU TEXT BOOK

بسم اللہ الرحمن الرحیم
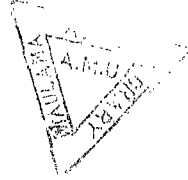
# زبانِ اُردو

۱۔ دہلی میں جو اب زبان مروّج ہے اور جس میں سب لوگ بولتے ہیں
اس کا نام "اردو" ہے اور تحقیق اس کی یوں ہے کہ اُردو فارسی لفظ ہے
اس کے معنی "بازار" کے ہیں اور "اُردو" سے مراد "اُردوئے شاہجہان" ہے
اگرچہ دلّی بہت قدیم شہر ہے اور ہندوؤں کے تمام راجہ پرجاؤں کا ہمیشہ سے
دارالسلطنت رہا ہے لیکن سب اپنی اپنی "بھاکا" بولتے تھے۔ ایک دوسرے
سے زبان نہیں ملتی تھی۔ جب کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی عملداری ہوئی اور
مسلمان لوگ ان شہروں میں آئے اور بھی مشکل پڑی اور نئی زبان کے لوگوں
کے آنے سے سودا سلف لینے دینے میں دقّت پڑنے لگی۔ اوّل تو مسلمانوں
کی عملداری میں اختلاف رہا کبھی کسی بادشاہ کی رہی اور کبھی کسی کی کبھی غوری
اسی اور کبھی لودی اور پٹھان اور کبھی مغل اس سبب سے زبان کا پدشور

اختلاف چلا گیا اور کوئی شخص اس کی اصلاح کے پیچھے نہ پڑا۔ جب کہ اکبر بادشاہ ہوا ایک گونہ سلطنت کو قیام ہوا، سب لوگ اپنے ٹھکانے بیٹھے اور علم کا چرچا ہوا، لیکن اس زمانہ میں فارسی زبان کی ایسی قدر تھی کہ لوگ اور کسی طرف متوجہ ہی نہیں ہوتے تھے۔

۴۔ جب کہ شہاب الدین شاہجہاں بادشاہ ہوا اور اس نے انتظام سلطنت کا کیا اور سب ملکوں کے وکلا کے حاضر رہنے کا حکم دیا اور دلّی شہر کو نئے سر سے آباد کیا اور قلعہ بنایا اور شاہجہاں آباد اس کا نام رکھا، اس وقت اس شہر میں تمام ملکوں کے لوگوں کا مجمع ہوا، ہر ایک کی رفتار گفتار جدا جدا تھی ہر ایک کا رنگ ڈھنگ نرالا تھا۔ جب آپس میں معاملہ کرتے ناچار ایک لفظ اپنی زبان کا دو لفظ اس کی زبان کے، تین لفظ دوسرے کی زبان کے ملا کر بولتے اور سودا سلف لیتے، رفتہ رفتہ اس زبان نے ایسی ترکیب پائی کہ یہ خود ایک زبان ہو گئی، اور چوں کہ یہ زبان خاص بادشاہی بازاروں میں مروّج تھی اس واسطے اس کو زبانِ اُردو کہا کرتے تھے اور بادشاہی امیر امرا اسی کو بولا کرتے تھے گویا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی یہی زبان تھی۔ ہوتے ہوتے خود اس زبان کا اُردو نام ہو گیا اور اُس وقت سے اس زبان

نے ایک رونق حاصل کی اور دن بدن تراش خراش اس میں ہوتی گئی یہاں تک کہ جس زمانہ میں میر اور سودا نے آوازہ اپنی خوش زبانی کا بلند کیا تھا اور یہ آویزہ ہر ایک کے کان میں پہنایا تھا اس وقت یہ زبان بہت درست ہو گئی تھی اور عجیب رنگ ڈھنگ نکال لائی تھی، اُن کے بعد کچھ کچھ اس زبان میں تغیر و تبدل ہوا اور ایسی منجھ گئی ہے کہ قیامت تک اس سے بہتر ہونی ممکن نہیں۔

۳۔ اس زبان کو شاہجہاں آباد سے ایسی نسبت ہے جیسی فارسی کو شیراز سے یعنی یہاں کے لوگوں کی زبان تمام اُردو بولنے والوں کو سند ہے نہیں تو بقول میر امن کے اپنی دستار، رفتار، گفتار کو کوئی بُرا نہیں جانتا۔ اگر ایک گنوار سے پوچھیے تو شہر والے کو نام رکھتا ہے اور اپنے تئیں سب سے بہتر سمجھتا ہے۔ خیر عاقلاں خود می دانند۔

۴۔ اگرچہ اس زبان میں اکثر فارسی و عربی و سنسکرت کے الفاظ مستعمل ہیں اور بعضے بعضوں میں کچھ تغیر و تبدل کر لیا ہے مگر اس زمانہ میں اور شہر کے لوگوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ اُردو زبان میں یا تو فارسی کے لغت بہت ملا دیتے ہیں اور یا فارسی کی ترکیب پر لکھنے لگتے ہیں یہ دونوں باتیں اچھی نہیں ان سے اُردو پن نہیں رہتا۔

(سرسید)

# بارش

جو سوکھی زمیں پر ترشّح ہوا / نکلتی ہے بو سوندھی سوندھی سی کیا

گرجتے ہیں بادل چمکتی ہے برق / ہوا صحن کا صحن پانی میں غرق

گئی نیند اچٹ پانی کے شور سے / بہی جاتی ہیں نالیاں زور سے

ٹپکتی ہے بنگلے کی وہ اولتی / کہ ہے تارِ سیمیں کی چلمن پڑی

ہوا زور سے چلتی ہے بار بار / پہنچتی ہے گھروں کے اندر پھوار

بنا ہے جو وہ ٹین کا سائباں / ہے اس وقت ارگن کا اس پر گماں

چٹانوں پہ کیا لطف نظّارہ ہے / کہ جو بوند ہے ایک فوّارہ ہے

صبا کے طمانچے جو کھائے ہیں آج / تو پودے سروں کو جھکائے ہیں آج

چلی آتی ہے بدلیوں کی قطار / ہوا کے ہیں گھوڑے پہ بادل سوار

دھواں دھار اس وقت چھایا ہے ابر / فلک پر سیہ مست آیا ہے ابر

جھکی شاخِ گل سبزہ کو چوم کر / برستی ہے کیا کیا گھٹا جھوم کر

ہیں آراستہ سبز پوشانِ باغ / ہوا غسل سے ہر شجر کو فراغ

یکایک رکی بوند ٹھہری ہوا / نظر آتی ہے وہ ہی کچھ فضا

تر و تازہ ہر نخل ہے شاد کام | لبالب ہیں پانی سے تھالے تمام
وہ آموں کے اشجار پر سامنے | کوئی کوکتا ہے بڑے زور سے
یہ ہے اُس صدا کا اثر کان پر | کہ دل لوٹ جاتا ہے ہر تان پر
ادھر کہہ رہا ہے کوئی "پی کہاں" | سُنا یہ تو قابو میں پھر جی کہاں
کہیں کوئی چلّا رہا ہے کہ ہاں | ذرا دیکھنا اس گھڑی کا سماں

پروں کو سمیٹے ہوئے وہ طیور
درختوں پہ بیٹھے ہیں کیا دور دور

(بینظیر شاہ)

---

# قصّہ حاتم طائی

حاتم طائی کے وقت میں ایک بادشاہ عرب کا نوفل نام تھا۔ اُس کو حاتم کے ساتھ بسبب نام آوری کے دشمنی کامل ہوئی۔ بہت سی فوج و لشکر جمع کر کے لڑائی کی خاطر چلا آیا۔ حاتم تو خدا ترس اور نیک مرد تھا یہ سمجھا کہ اگر میں بھی جنگ کی تیاری کروں تو خدا کے بندے مارے جائیں گے

اور بڑی خوں ریزی ہو گی، اس کا عذاب میرے نام لکھا جائے گا۔ یہ سوچ کر تن تنہا اپنی جان لے کر ایک پہاڑ کی کھوہ میں جا چھپا۔ جب حاتم کے غائب ہونے کی خبر نوفل کو معلوم ہوئی۔ حاتم کا سب اسباب قرق کیا اور منادی کرادی کہ جو کوئی حاتم کو پکڑ لائے پانسو اشرفی انعام پائے۔ یہ سن کر سب کو لالچ آیا اور جستجو حاتم طائی کی کرنے لگے۔ ایک روز ایک بڑھیا اور اس کا بڈھا دو تین بچے ساتھ لئے ہوئے لکڑیاں توڑنے کے لیے اُس غار میں جہاں حاتم پوشیدہ تھا پہنچے اور لکڑیاں چننے لگے۔ بڑھیا بولی کہ اگر ہمارے دن بھلے آتے تو حاتم کو کہیں دیکھ پاتے اور اس کو نوفل پاس لے جاتے۔ وہ پانسو اشرفیاں دیتا تو آرام سے کھاتے اور دکھ دھندے سے چھوٹ جاتے۔ بڈھے نے کہا ٹر ٹر کرتی ہو ہمارے طالع میں یہی لکھا ہو کہ روز لکڑیاں توڑیں اور سر پر دھر کر بازار میں بیچیں تب روٹی میسر آئے...... لے اپنا کام کر۔ حاتم ہمارے ہاتھ کاہے کو آئے گا کہ بادشاہ سے اتنے روپئے دلا دے گا۔ عورت ٹھنڈی سانس بھر کر چپ ہو رہی۔ ان دونوں کی باتیں حاتم نے سنیں۔ مردمی اور مروت سے بعید جانا کہ آپ کو چھپائے اور جان کو بچائے اور ان بیچاروں کو مطلب تک نہ پہنچائے۔ سچ ہے

جس آدمی میں رحم نہیں وہ انسان نہیں قصائی ہے۔

غرض کہ حاتم نے قبول نہ کیا کہ اپنے کانوں سے سن کر چپکا ہو رہے وہیں باہر آکر بڈھے سے کہا کہ اے عزیز حاتم میں ہی ہوں۔ مجھ کو نوفل پاس لے چل۔ وہ مجھ کو دیکھ کر جو کچھ روپیہ دینے کا اقرار کیا ہے تجھے دیگا۔ بڈھے نے کہا سچ ہے۔ اس صورت میں بھلائی اور بہبودی میری البتہ ہے لیکن نہ معلوم وہ تیرے ساتھ کیا سلوک کرے اگر مار ڈالے تو میں کیا کروں۔ یہ مجھ سے ہرگز نہ ہوگا کہ تجھ سے انسان کو اپنی خاطر جمع کے لئے دشمن کے حوالے کر دوں۔ وہ مال کتنے دن کھاؤں گا اور کتنے دن جیوں گا آخر مروں گا تو خدا کو کیا جواب دوں گا۔ حاتم نے بہتیری منت کی کہ مجھے لے چل میں خوشی سے کہتا ہوں اور ہمیشہ اسی آرزو میں رہتا ہوں کہ میری جان و مال کسی کے کام آئے تو بہتر ہے لیکن وہ بڈھا کسی طرح حاتم کو لے جانے پر راضی نہ ہوا۔ آخر ناچار ہو کر حاتم نے کہا کہ اگر تو مجھے نہیں لے جاتا تو میں خود ہی بادشاہ پاس جا کر کہتا ہوں کہ اس بڈھے نے مجھے پہاڑ کی کھو میں چھپا رکھا تھا۔ وہ بڈھا ہنس کر بولا کہ اگر بھلائی کے بدلے برائی ملے تو یا نصیب۔ اس سوال و جواب میں اور آدمی بھی آگئے۔ انھوں

نے معلوم کیا کہ حاتم یہی ہے۔ حاتم کو تُرت پکڑ لیا اور لے چلے۔ وہ بڈھا
بھی افسوس کرتا ہوا پیچھے پیچھے ہو لیا، جب نوفل کے پاس لے گئے تو
اُس نے پوچھا کہ ان کو کون پکڑ لایا ہے۔ ایک بدذات بولا کہ یہ کام سوائے
میرے اور کون کر سکتا ہے؟ یہ فتح ہمارے نام ہے اور ہم نے جھنڈا عرش
پر گاڑا ہے۔ ایک اور لنترانی والا ڈینگ مار کر بولا کہ میں کئی دن سے دوڑ دھوپ
کر کے جنگل سے پکڑ لایا ہوں۔ میری محنت پر نظر کیجیے۔

اسی طرح اشرفیوں کے لالچ سے ہر کوئی کہتا تھا کہ یہ کام مجھ سے ہوا
وہ بڈھا چپکا کھڑا سب کی شیخیاں سن رہا تھا اور حاتم کی خاطر کھڑا رو رہا تھا
جب اپنی اپنی مردانگی سب بگھار چکے تو حاتم نے کہا کہ سچ بات یہ ہے کہ وہ بڈھا
جو سب سے الگ کھڑا ہے مجھے لایا ہے اگر قیافہ سے جاننا چاہتے ہو تو دریافت
کر لو اور میرے پکڑے جانے کی خاطر جو قول کیا ہے پورا کرو کہ سارے ڈیل
میں زبان ہی ایک چیز ہے، مرد کو چاہیے کہ جو کہے سو کرے، یوں تو جیبھ حیوان
کو بھی خدا نے دی ہے، پھر انسان اور حیوان میں کیا تفاوت ہے، نوفل نے اُس
بڈھے کو پاس بلا کر پوچھا کہ سچ کہہ اصل کیا ہے؟ حاتم کو کون پکڑ کر لایا ہے
اُس نے تمام حال کہہ سنایا اور کہا کہ حاتم میری خاطر آپ ہی چلا آیا ہے۔ نوفل

حاتم کی یہ ہمت سُن کر متعجب ہوا کہ بل بے تیری سخاوت، اپنی جان کا خطر نہ کیا، جتنے لوگ جھوٹے دعوے حاتم کے پکڑ لانے کے کرتے تھے حکم دیا کہ پانسو اشرفی کے عوض پانسو جوتیاں ان کے سروں پر لگاؤ کہ ان کا بھیجا نکل پڑے، وہیں تڑ تڑ پیزاریں پڑنے لگیں۔ ایک دم میں ان کے سر گنجے ہوگئے سچ ہے جھوٹ بولنا ایسا ہی گناہ ہے کہ کوئی اس کو نہیں پہونچ سکتا۔ خدا سب کو اس بلا سے محفوظ رکھے اور جھوٹ بولنے کا چسکا نہ دے بہت لوگ جھوٹ موٹ بکے جاتے ہیں لیکن آزمائش کے وقت سزا پاتے ہیں بغرض اُن سب کو موافق اُن کے انعام دے کر نوفل نے اپنے دل میں خیال کیا کہ حاتم سے شخص سے جس سے دنیا کو فیض پہنچتا ہو اور جو محتاجوں کی خاطر اپنی جان تک سے دریغ نہیں کرتا اور خدا کی راہ میں سر تا پا حاضر ہو دشمنی رکھنی اور اُس کا مدعی ہونا آدمیت اور انسانیت سے بعید ہے۔ تواضع اور تعظیم کر کے پاس بٹھایا اور حاتم کا ملک واملاک اور مال و اسباب جو کچھ ضبط کیا تھا وہیں چھوڑ دیا۔ نئے سر سے سرداری قبیلہ طے کی اُسے دی اور اُس بڈھے کو پانسو اشرفیاں اپنے خزانہ سے دلوادیں وہ دعائیں دیتا چلا گیا۔

# ایک پرندے کی فریاد

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ — وہ جھاڑیاں چمن کی وہ میرا آشیانہ

وہ ساتھ سب کے اُڑنا وہ سیر آسماں کی — وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا مل کے گانا

پتوں کا ٹہنیوں پر وہ جھومنا خوشی میں — ٹھنڈی ہوا کے پیچھے وہ تالیاں بجانا

آزادیاں کہاں اب وہ اپنے گھونسلے کی

اپنی خوشی سے جانا اپنی خوشی سے آنا

لگتی ہے چوٹ دل پر آتا ہے یاد جس دم — شبنم کا صبح آکر پھولوں کا منہ دھلانا

وہ پیاری پیاری صورت وہ کامنی سی مورت — آباد جس کے دم سے تھا میرا آشیانہ

تڑپا رہی ہے مجھ کو رہ رہ کے یاد اس کی — تقدیر میں لکھا تھا پنجرے کا آشیانہ

اس قید کا الٰہی دکھڑا کسے سناؤں

ڈر ہے یہیں قفس میں میں غم سے مر جاؤں

کیا بدنصیب ہوں میں گھر کو ترس رہا ہوں — ساتھی تو ہیں وطن میں میں قید میں پڑا ہوں

آئی بہار کلیاں پھولوں کی ہنس رہی ہیں — میں اس اندھیرے گھر میں قسمت کو رو رہا ہوں

باغوں میں بسنے والے خوشیاں منا رہے ہیں — میں دل جلا اکیلا دکھ میں کراہتا ہوں

آتی نہیں صدائیں اُن کی مرے قفس میں
ہوتی مری رہائی اے کاش میرے بس میں

ارمان ہے یہ جی میں اُڑ کر چمن کو جاؤں
ٹہنی پہ گُل کی بیٹھوں آزاد ہو کے گاؤں
بیری کی شاخ پر ہو ایسا ہی پھر بسیرا
اُس اجڑے گھونسلے کو پھر جا کے میں بساؤں
چگتا پھروں چمن میں دانے زرا زرا سے
ساتھی جو ہیں پرانے اُن سے ملوں ملاؤں

پھر دن پھریں ہمارے پھر سیر ہو وطن کی
اُڑتے پھریں خوشی سے کھائیں ہوا چمن کی

جب سے چمن چھٹا ہے یہ حال ہو گیا ہے
دل غم کو کھا رہا ہے غم دل کو کھا رہا ہے
گانا اسے سمجھ کر خوش ہوں نہ سننے والے
دُکھے ہوئے دلوں کی فریاد یہ صدا ہے
آزاد جس نے رہ کر دن اپنے ہوں گذارے
اُس کو بھلا خبر کیا یہ قید کیا بلا ہے

آزاد مجھ کو کر دے او قید کرنے والے
میں بے زباں ہوں قیدی تو چھوڑ کر دعا لے

(اقبال)

# گزرا ہوا زمانہ

برس کی آخیر رات کو ایک بڈھا اپنے اندھیرے گھر میں اکیلا بیٹھا ہے رات بھی ڈراونی اور اندھیری ہے گھٹا چھا رہی ہے بجلی تڑپ تڑپ کر کڑکتی ہے آندھی بڑے زور سے چلتی ہے دل کانپتا ہے اور دم گھبراتا ہے۔ بڈھا نہایت غمگین ہے مگر اس کا غم نہ اندھیرے گھر پر ہے نہ اکیلے پن پر اور نہ اندھیری رات اور نہ بجلی کی کڑک اور آندھی کی گونج پر اور نہ برس کی آخیر رات پر وہ اپنے پچھلے زمانہ کو یاد کرتا ہے اور جتنا زیادہ یاد آتا ہے اتنا ہی غم بڑھتا ہے ہاتھوں سے ڈھکے ہوئے منہ پر آنکھوں سے آنسو بھی بہتے چلے جاتے ہیں۔

پچھلا زمانہ اس کی آنکھوں کے سامنے پھرتا ہے اپنا لڑکپن اس کو یاد آتا ہے جب کہ اس کو کسی چیز کا غم اور کسی بات کی فکر دل میں نہ تھی۔ روپیہ اشرفی کے بدلے ریوڑی اور مٹھائی اچھی لگتی تھی سارا گھر یہاں باپ بھائی بہن اس کو پیار کرتے تھے پڑھنے کے لئے چھٹی کا وقت جلد آنے کی خوشی میں کتابیں بغل میں لئے مکتب میں چلا جاتا تھا۔ مکتب کا خیال آتے ہی اس کو اپنے ہم مکتب یاد آتے تھے وہ اور زیادہ غمگین ہوتا تھا اور بے اختیار چلا اٹھتا تھا ہائے

وقت! ہائے وقت!! ہائے گزرے ہوئے زمانے! افسوس کہ میں نے تجھے بہت دیر میں یاد کیا۔

پھر وہ اپنی جوانی کا زمانہ یاد کرتا تھا۔ اپنا سُرخ سفید چہرہ۔ سڈول ڈیل بھرا بھرا بدن۔ رسیلی آنکھیں، موتی کی سی لڑی سو دانت، اُمنگ بھرا ہوا دل، جذباتِ انسانی کے جوشوں کی خوشی اُسے یاد آتی تھی اس آنکھوں میں اندھیرا چھائے ہوئے زمانہ میں ماں باپ جو نصیحت کرتے تھے اور نیکی اور خدا پرستی کی بات بتاتے تھے اور یہ کہتا تھا کہ "اوہ! ابھی بہت وقت ہے" اور بڑھاپے آنے کا کبھی خیال بھی نہیں کرتا تھا اس کو یاد آتا تھا اور افسوس کرتا تھا کہ کیا اچھا ہوتا اگر جب ہی میں اس وقت کا خیال کرتا اور خدا پرستی اور نیکی سے اپنے دل کو سنوارتا اور موت کے لئے تیار رہتا۔ آہ وقت گزر گیا، آہ وقت گزر گیا اب پچھتائے کیا ہوتا ہے، افسوس میں نے اپنے تئیں ہمیشہ یہ کہہ کر برباد کیا کہ ابھی وقت بہت ہے۔ یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور ٹٹول ٹٹول کر کھڑکی تک آیا کھڑکی کھولی دیکھا کہ رات ویسی ہی ڈراونی ہے، اندھیری گھٹا چھا رہی ہے۔ بجلی کی کڑک سے دل پھٹا جاتا ہے، ہولناک آندھی چل رہی ہے درختوں کے پتے اڑتے ہیں اور ٹہنے ٹوٹتے ہیں تب وہ چلا کر بولا ہائے

ہائے میری گزری ہوئی زندگی بھی ایسی ہی ڈراونی ہے جیسی یہ رات یہ کہہ کر پھر اپنی جگہہ آبیٹھا اتنے میں اس کو اپنے ماں باپ، بھائی بہن، دوست آشنا یاد آئے جن کی ہڈیاں قبروں میں گل کر خاک ہو چکی تھیں ماں گویا محبت سے اس کو چھاتی سے لگائے آنکھوں میں آنسو بھرے کھڑی ہے یہ کہتی ہوئی کہ ہائے بیٹا وقت گزر گیا باپ کا نورانی چہرہ اس کے سامنے ہے اور اس میں سے یہ آواز آتی ہے کہ کیوں بیٹا ہم تمہارے ہی بھلے کے لئے نہ کہتے تھے بھائی بہن دانتوں میں انگلیاں دئے ہوئے خاموش ہیں اور اُن کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی جاری ہے۔ دوست آشنا سب غمگین کھڑے ہیں کہ اب ہم کیا کر سکتے ہیں۔

ایسی حالت میں اس کو وہ باتیں یاد آتی تھیں جو اُس نے نہایت بے پروائی اور بے مروتی اور کج خلقی سے اپنے ماں باپ بھائی بہن دوست آشنا کے ساتھ برتی تھیں۔ ماں کو رنجیدہ رکھنا۔ باپ کو ناراض کرنا۔ بھائی بہن سے بے مروت رہنا۔ دوست آشنا کے ساتھ ہمدردی نہ کرنا یاد آتا تھا اور اس پرانی گلی ہڈیوں میں سے ایسی محبت کا دیکھنا اُس کے دل کو پاش پاش کرتا تھا اس کا دم چھاتی میں گھٹا جاتا تھا اور یہ کہہ کر چلا اٹھتا تھا کہ

ہائے وقت نکل گیا ہائے وقت نکل گیا اب کیوں کر اس کا بدلہ ہو وہ گھبرا کر پھر کھڑکی کی طرف دوڑا اور ٹکراتا لڑکھڑاتا کھڑکی تک پہنچا اس کو کھولا اور دیکھا کہ ہوا کچھ ٹھیری ہے اور بجلی کی کڑک کچھ تھمی ہے پر رات ویسی ہی اندھیری ہے اس کی گھبراہٹ کچھ کم ہوئی اور پھر اپنی جگہ آ بیٹھا۔

اتنے میں اس کو اپنا ادھیڑپنا یاد آیا جس میں نہ وہ جوانی رہی تھی اور نہ وہ جوانی کا جوبن۔ نہ وہ دل رہا تھا اور نہ دل کے ولولوں کا جوش۔ اس نے اپنی اس نیکی کے زمانہ کو یاد کیا جس میں وہ بہ نسبت بدی کے نیکی کی طرف زیادہ مائل تھا وہ اپنا روزہ رکھنا۔ نمازیں پڑھنی۔ حج کرنا۔ زکوٰۃ دینی بھوکوں کو کھلانا۔ مسجدیں اور کنوئیں بنوانا۔ یاد کرکے اپنے دل کو تسلی دیتا تھا۔ فقیروں اور درویشوں کو جن کی خدمت کی تھی۔ اپنے پیروں کو جن سے بیعت کی تھی اپنی مدد کو پکارتا تھا۔ مگر دل کی بے قراری نہیں جاتی تھی وہ دیکھتا تھا کہ اس کے ذاتی اعمال کا اسی تک خاتمہ ہے۔ بھوکے پھر ویسے ہی بھوکے ہیں۔ مسجدیں ٹوٹ کر یا تو کھنڈر ہیں اور پھر ویسے ہی جنگل ہیں۔ کنوئیں اندھے پڑے ہیں نہ پیر اور نہ فقیر۔ کوئی اس کی آواز نہیں سنتا اور نہ مدد کرتا ہے اس کا دل پھر گھبراتا ہے اور سوچتا ہے کہ میں نے کیا کیا جو تمام فانی چیزوں پر دل لگایا

پچھلی سمجھ پہلے ہی کیوں نہ سوجھی، اب کچھ نہیں بس چلتا اور پھر یہ کہہ کر چلّا اٹھا ہائے وقت، ہائے وقت میں نے تجھ کو کیوں کھو دیا۔

وہ گھبرا کر پھر کھڑکی کی طرف دوڑا۔ اس کے پٹ کھولے تو دیکھا کہ آسمان صاف ہے۔ آندھی تھم گئی ہے گھٹا کھل گئی ہے تارے نکل آئے ہیں اُن کی چمک سے اندھیرا بھی کچھ کم ہو گیا ہے وہ دل کے بہلانے کے لئے تاروں بھری رات کو دیکھ رہا تھا کہ یکایک اس کو آسمان کے بیچ میں ایک روشنی دکھائی دی اور اُس میں ایک خوبصورت دُلہن نظر آئی۔ اُس نے ٹکٹکی باندھ کر اُسے دیکھنا شروع کیا جوں جوں وہ اُسے دیکھتا تھا وہ قریب ہوتی جاتی تھی یہاں تک کہ وہ اُس کے بہت پاس آگئی وہ اُس کے حسن و جمال کو دیکھ کر حیران ہو گیا اور نہایت پاک دل اور محبت کے لہجہ سے اُس سے پوچھا کہ تم کون ہو وہ بولی "میں ہمیشہ زندہ رہنے والی نیکی ہوں" اُس نے پوچھا کہ "تمھاری تسخیر کا بھی کوئی عمل ہے" وہ بولی "ہاں ہے۔ نہایت آسان پر بہت مشکل۔ جو کوئی خدا کے فرض اُس بدوی کی طرح جس نے کہا کہ "واللہ نہ اس میں سے میں کچھ کم کروں گا نہ زیادہ" ادا کرکے انسان کی بھلائی اور اُس کی بہتری میں سعی کرے۔ اس کی میں مسخر ہوتی ہوں۔ دنیا میں کوئی چیز

ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے۔ انسان ہی ایک ایسی چیز ہے جو اخیر تک رہے گا پس جو بھلائی کہ انسان کی بہتری کے لئے کی جاتی ہے وہی نسل در نسل اخیر تک چلی آتی ہے۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اسی تک ختم ہو جاتا ہے۔ اس کی موت اُن سب چیزوں کو ختم کر دیتی ہے مادّی چیزیں بھی چند روز میں فنا ہو جاتی ہیں مگر انسان کی بھلائی اخیر تک جاری رہتی ہے۔ میں تمام انسانوں کی روح ہوں جو مجھے تسخیر کرنا چاہے انسان کی بھلائی میں کوشش کرے کم سے کم اپنی قوم کی بھلائی میں دل و جان و مال سے ساعی ہو یہ کہہ کر وہ دلہن غائب ہو گئی اور بڈھا پھر اپنی جگہہ پر آ بیٹھا۔

اب پھر اُس نے اپنا پچھلا زمانہ یاد کیا اور دیکھا کہ اس نے اپنی پچپن برس کی عمر میں کوئی کام بھی انسان کی بھلائی اور کم سے کم اپنی قومی بھلائی کا نہیں کیا تھا اس کے تمام کام ذاتی غرض پر مبنی تھے نیک کام جو کئے تھے ثواب کے لالچ اور گویا خدا کو رشوت دینے کی نظر سے کئے تھے۔ خاص قومی بھلائی کی خالص نیّت سے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔

اپنا حال سوچ کر وہ اس دل فریب دلہن کے ملنے سے مایوس ہوا اپنا اخیر زمانہ دیکھ کر آئندہ کرنے کی بھی کچھ اُمید نہ پائی۔ تب تو نہایت مایوسی کی

حالت میں بے قرار ہو کر چلا اٹھا "ہائے وقت! کیا پھر تجھے
میں بلا سکتا ہوں۔ ہائے میں دس ہزار دینار میں دیتا اگر وقت پھر آتا اور میں
جوان ہو سکتا۔ یہ کہہ کر اس نے ایک آہ سرد بھری اور بیہوش ہو گیا۔

تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ اس کے کانوں میں میٹھی میٹھی باتوں کی آواز
آنے لگی اس کی پیاری ماں اس کے پاس کھڑی ہوئی اس کو گلے لگا کر اس
کی چمی لی اس کا باپ اس کو دکھائی دیا۔ چھوٹے چھوٹے بھائی بہن اس
کے گرد کھڑے ہوئے۔ ماں نے کہا کہ بیٹا کیوں برس کے برس دن روتا
ہے۔ کیوں تو بے قرار ہے کس لئے تیری ہچکی بندھ گئی ہے۔ اٹھ منہ ہاتھ دھو
کپڑے پہن۔ نوروز کی خوشی منا تیرے بھائی بہن تیرے منتظر کھڑے ہیں تب
وہ لڑکا جاگا اور سمجھا کہ میں نے خواب دیکھا اور خواب میں بڈھا ہو گیا
تھا۔ اس نے اپنا سارا خواب اپنی ماں سے کہا اس نے سن کر اس کو جواب
دیا کہ "بیٹا بس تو ایسا مت کر جیسا کہ اس پشیمان بڈھے نے کیا بلکہ ایسا
کر جیسا تیری دلہن نے تجھ سے کہا۔"

یہ سن کر وہ لڑکا پلنگ پر سے کود پڑا اور نہایت خوشی سے پکارا
کہ "او ہو یہی میری زندگی کا پہلا دن ہے۔ میں کبھی اس بڈھے کی طرح نہ

پچھتاؤں گا اور ضرور اُس دُلہن کو بیاہوں گا جس نے ایسا خوبصورت اپنا چہرہ مجھ کو دکھلایا اور ہمیشہ زندہ رہنے والی نیکی اپنا نام تبلایا او خدا او خدا تو میری مدد کر۔ آمین"

پس اے میرے پیارے نوجوان ہم وطنو! اور اے میری قوم کے بچّو!! اپنی قوم کی بھلائی پر کوشش کرو تاکہ اخیر وقت میں اُس بڈھے کی طرح نہ پچھتاؤ۔ ہمارا زمانہ تو اخیر ہے اب خدا سے یہ دعا ہے کہ کوئی نوجوان اُٹھے اور اپنی قوم کی بھلائی میں کوشش کرے۔ آمین۔

---

# وطن کی یاد

بیزار اک اپنی جان و تن سے — بچھڑا ہوا صحبتِ وطن سے
غربت کی صعوبتوں کا مارا — چلنے کا نہیں ہے جس کو یارا
غم خوار ہے کوئی اور نہ دلجو — اک باغ میں ہے پڑا لبِ جو
ہیں دھیان میں کلفتیں سفر کی — اپنے کی خبر ہے اور نہ گھر کی
ابر اتنے میں اک طرف سے اُٹھا — اور رنگ سا کچھ ہوا کا بدلا

برق آنے لگی تڑپکے پیہم — اور پڑنے لگی پھوار کم کم

آنے جو لگے ہوا کے جھونکے — تھے جتنے سفر کے رنج بھولے

سامان ملے جو دل لگی کے — یاد آئے مزے کبھی کبھی کے

دیکھے کوئی اس گھڑی کا عالم — وہ آنسوؤں کی جھڑی کا عالم

وہ آپ ہی آپ گنگنانا — اور جوش میں آ کبھی یہ گانا

اے چشمۂ آبِ زندگانی — گھٹیو نہ کبھی تری روانی

جاتی ہو جدھر تری سواری — بستی ہے اُسی طرف ہماری

پائے جو کہیں مری سبھا کو — دیتا ہوں میں بیچ میں خدا کو

اوّل - کہیو - سلام میرا — پھر دیجیو یہ پیام میرا

قسمت میں یہی تھا اپنی لکھا — فرقت میں تمھاری آئی برکھا

آتا ہے تمھارا دھیان جس دم — مرغابیاں تیرتی ہیں باہم

ہم تم یوں ہی ہاتھ میں دئے ہاتھ — پھرتی تھیں ہوائیں کھاتے دن رات

جب سبزہ و گل ہیں لہلہاتے — صحبت کے مزے ہیں یاد آتے

جب پیڑ سے آم ہے ٹپکتا — میں تم کو ادھر ادھر ہوں تکتا

آخر نہیں پاتا جب کسی کو — دیتا ہوں دعائیں بیکسی کو

رُت آموں کی آئے اور نہ ہو یاں — جی اپنا ہے ایسی رُت سے بیزار
تم بن جو ہے بوند تن پہ پڑتی — چنگاری سی ہے بدن سے اُڑتی
ہے سرد ہوا بدن کو لگتی — پر دل میں ہے آگ سی سلگتی
پردیس میں سچ ہے کیا ہو جی شاد — جب جی میں بھری ہو دیس کی یاد
نشتر کی طرح تھی دل میں چبھتی — فریاد یہ دردناک اُس کی
تھا سوز میں کچھ ملا ہوا ساز — پکڑا گیا دل سُن اس کی آواز
حیرت رہی دیر تک یہ آخر — روڑا ہے کہاں کا یہ مُسافر

پھر غور سے اک نظر جو ڈالی
نکلا وہ ہمارا دوست حالی

(مولانا حالی)

---

# ماں کا خواب

میں سوئی جو اک شب تو دیکھا یہ خواب — بڑھا اور جس سے مرا اضطراب
یہ دیکھا کہ میں جا رہی ہوں کہیں — اندھیرا ہے اور راہ ملتی نہیں
لرزتا تھا ڈر سے مرا بال بال — قدم کا تھا دہشت سے اُٹھنا محال

جو کچھ حوصلہ پا کے آگے بڑھی	تو دیکھا قطار ایک لڑکوں کی تھی

زمرّد سی پوشاک پہنے ہوئے	دیئے سب کے ہاتھوں میں جلتے ہوئے

وہ چپ چاپ تھے آگے پیچھے رواں	خدا جانے جانا تھا اُن کو کہاں

اسی سوچ میں تھی کہ میرا پسر	مجھے اس جماعت میں آیا نظر

وہ پیچھے تھا اور تیز چلتا نہ تھا	دیا اُس کے ہاتھوں میں جلتا نہ تھا

کہا میں نے پہچان کر میری جاں	مجھے چھوڑ کر آ گئے تم کہاں

جدائی میں رہتی ہوں میں بے قرار	پروتی ہوں ہر روز اشکوں کے ہار

نہ پروا ہماری ذرا تم نے کی	گئے چھوڑ اچھی وفا تم نے کی

جو بچّے نے دیکھا مرا پیچ و تاب	دیا اُس نے مُنہ پھیر کر یوں جواب

رُلاتی ہے تجھ کو جدائی مری	نہیں اس میں کچھ بھی بھلائی مری

یہ کہہ کر وہ کچھ دیر تک چپ رہا	دیا پھر دکھا کر یہ کہنے لگا

سمجھتی ہے تو ہو گیا کیا اُسے

ترے آنسوؤں نے بجھایا اُسے

اقبال

# "ادب"

تم کو سمجھنا چاہئے کہ گو آدمی سب ایک طرح کے ہیں، دو کان، دو ہاتھ دو ٹانگیں، ایک ناک ایک سر سب کے برابر ہیں لیکن پھر بھی آدمیوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ کوئی باپ ہے کوئی بیٹا۔ کوئی استاد ہے کوئی شاگرد، کوئی آقا اور مالک، کوئی نوکر اور خادم، کوئی مولوی کوئی جاہل، کوئی حاکم، کوئی طبیب کوئی دکان دار، کوئی مزدور، پس اگر سب آدمی درجے میں برابر ہوں تو دنیا کا تمام انتظام ٹوٹ جائے اس لئے ہر ایک کے واسطے اور خاص رتبے مقرر ہیں، بیٹے کو باپ کا، شاگرد کو استاد کا، نوکر کو مالک کا، اور بیمار کو طبیب کا حکم ماننا لازم و واجب ہے۔

۲۔ عمر، رشتے، ذات، تمیز، لیاقت، دولت اور حکومت سے بھی درجہ معلوم ہوتا ہے جس کی عمر زیادہ ہو اور رشتے میں بڑا، یا جو ذات میں شریف ہو جیسے مسلمانوں میں سید اور ہنود میں برہمن، یا جس کو لیاقت زیادہ ہو جیسے مولوی اور پنڈت یا جو دولت مند یا حاکم ہو سب قابل ادب ہیں۔

۳۔ اگر تم ادب کرتے ہو تو مت سمجھو کہ ہم دنیا کی ایک رسم ادا کرتے ہیں

اور اگر ادب نہ بھی کریں تب بھی کچھ نقصان نہیں۔ خبردار۔ ایسی بات، ہرگز ذہن میں مت آنے دو، ادب نہ کرنے میں سراسر تمہارا نقصان ہے جس کا تم ادب کروگے ضرور وہ تم سے خوش ہوگا اور اس کا جی چاہیگا کہ تمہیں کچھ نفع پہنچائے۔ استاد کا ادب کروگے جی لگاکر اور سمجھاکر سبق دیگا، جب بھولوگے خوشی سے بتادیگا۔ ماں باپ کا ادب کرو تو دیکھو کیسے کیسے چین تم کو کراتے ہیں جو مانگا وہ موجود، جو کہا وہ حاضر۔ حاکم کا ادب کرو تو وہ عزت سے پاس بٹھائے گا۔ ہر بات میں تمہاری رعایت کرتا رہیگا۔

۴۔ اب ادب نہ کرنے والوں کی حالت پر نظر کرو، بے ادب شاگرد کو استاد بے دل سے پڑھاتا ہے بھولا ہوا پوچھتا ہے تو بتانے میں دریغ کرتا ہے اور کہتا ہے دیکھا یہ سمجھ ہے ایک دفعہ بتایا ہوا یاد نہیں رکھتا اُٹھ اور اپنی جگہ پر کھڑا ہو۔ بے ادب بیٹا ماں سے کچھ چیز مانگتا ہے تو ماں کہتی ہے چل دور ہو میں نہیں دیتی۔

۵۔ بے ادب جب حاکم کے دربار میں جاتا ہے تو چپراسی الگ دھکے دیتے ہیں، نذکوری الگ۔ ادب صرف حکم ماننا ہی نہیں ہے، اگر تم باپ کا حکم مانو تم نے باپ کا ادب پورا نہیں کیا بلکہ ادب میں حکم ماننے کے علاوہ دل سے اطاعت اور دل سے تعظیم یعنی بڑائی کرنا ضروری ہے۔ تم پر جس جس کا ادب

کرنا لازم ہے ان کو جھک کر سلام کرو جہاں تک ہو سکے اُن کی خدمت کرو۔ اُن کے سامنے بدلحاظی کی کوئی بات مت کرو یہاں تک کہ نشست و برخاست میں بھی اتنا لحاظ کرو کہ اُن کی طرف پشت نہو، اُن سے اونچے مت بیٹھو، اُن کی طرف پاؤں مت پھیلاؤ، اُن کے آگے مت چلو۔ اُن سے بات چیت میں ردّ و کد مت کرو، اُن کے سامنے بہت مت بولو اور بہت مت ہنسو۔ اُن سے آنکھ مت ملاؤ، اُن کا نام نہ لو اور جو ضرور نا لو بھی تو بہت ادب کے ساتھ نام کے پہلے لفظ جناب، اور نام کے بعد لفظ صاحب لگا کر لو۔ جب تم اتنی باتیں کروگے تو ادب والے پیارے بیٹے کہلاؤ گے۔

(مولانا نذیر احمد)

# ایک پہاڑ اور گلہری

کوئی پہاڑ یہ کہتا تھا اک گلہری سے — تجھے ہو شرم تو پانی میں جا کے ڈوب مرے

ذرا سی چیز ہے اس پر غرور! کیا کہنا! — یہ عقل اور یہ سمجھ یہ شعور! کیا کہنا!

خدا کی شان ہے نا چیز۔ چیز بن بیٹھیں — جو بے شعور ہوں یوں با تمیز بن بیٹھیں

تری بساط ہے کیا میری شان کے آگے — زمیں ہے پست مری آن بان کے آگے

جو بات مجھ میں ہے تجھکو وہ ہے نصیب کہاں　　بھلا پہاڑ کہاں، جانور غریب کہاں
کہا یہ سُنکے گلہری نے منہ سنبھال ذرا　　یہ کچّی باتیں ہیں دل سے اِنہیں نکال ذرا
جو میں بڑی نہیں تیری طرح تو کیا پروا　　نہیں ہے تو بھی تو آخر مری طرح چھوٹا
ہر ایک چیز سے پیدا خدا کی قدرت ہے　　کوئی بڑا کوئی چھوٹا یہ اُس کی حکمت ہے
بڑا جہان میں تجھکو بنادیا اُس نے　　مجھے درخت پہ چڑھنا سکھادیا اُس نے
قدم اُٹھانے کی طاقت نہیں ذرا تجھ میں　　نری بڑائی ہے خوبی ہے اور کیا تجھ میں
جو تو بڑا ہے تو مجھ سا ہنر دکھا مجھکو　　یہ چھالیاں ہی ذرا توڑ کر دکھا مجھکو

نہیں ہے چیز نکمّی کوئی زمانے میں
کوئی بُرا نہیں قدرت کے کارخانے میں

اقبال

---

# ہمدردی

## (ایک قصّہ)

ایک دن نصوح نے نمازِ عصر سے فارغ ہو کر منجھلے بیٹے علیم کو پُچھوایا کہ دیکھو مدرسہ سے آئے یا نہیں معلوم ہوا کہ ابھی آئے ہیں اور کپڑے اُتار رہے

ہیں۔ تو کہلا بھیجا کہ اپنی ضرورتوں سے فارغ ہو کر ذرا میرے پاس ہو جائیں۔ تھوڑی دیر میں علیم باپ کی خدمت میں جا حاضر ہوا۔ دیکھتے ہی باپ نے کہا آؤ صاحب آج کل تو میں نے سنا ہے تم کو بڑی محنت کرنی پڑتی ہے"۔

علیم۔ ششماہی امتحان قریب ہے اُسی کی تیاری کر رہا ہوں۔

نصوح۔ علاوہ کورس کی کتابوں کے کوئی اور بھی کتاب کبھی پڑھتے ہو"۔ تعلیم کا سارا مقصد انسانیت پیدا کرنا ہوتا ہے اور انسانیت صحیح عمل کا دوسرا نام ہے۔

علیم۔ ایک پادری صاحب نے مجھے کچھ دن ہوئے ایک کتاب دی تھی اُس کتاب کو پڑھکر میرے دل پر عجیب اثر پڑا تھا۔ یا تو میری یہ کیفیت تھی کہ مصیبت زدہ لوگوں کو دیکھکر ہنسا کرتا تھا یا اس کتاب کی برکت سے دوسروں کی تکلیف کو میں اپنی تکلیف سمجھنے لگا۔

نصوح۔ وہ کوئی مذہبی کتاب ہو گی۔ ایسی کتابوں میں ہمدردی اور خاکساری کی خصوصیت سے تعلیم دی جاتی ہے۔ مگر صرف پڑھ لینا کافی نہیں عمل شرط ہے۔

علیم۔ میں نہیں کہہ سکتا یہ ہمدردی ہے یا نہیں مگر جب سے وہ کتاب پڑھی

ہے میں ہمیشہ اُن لڑکوں کو جو مجھ سے کچھ پڑھنا چاہتے ہیں اپنا ہرج کرکے بھی پڑھا دیتا ہوں۔ بلکہ ایک مرتبہ میں ایک دقّت میں بھی مبتلا ہو گیا تھا۔

نصوح۔ وہ کیا؟

علیم۔ ایک مرتبہ عبید کو ایک بڑی بھاری ٹوپی مجھکو اماّ جان نے بنا دی تھی وہی ٹوپی اوڑھے ہوئے میں خالہ جان کے یہاں جاتا تھا۔ میاں مسکین کے کوچہ میں پہنچا تو بہت سے چپراسی پیادے ایک گھر کو گھیرے ہوئے تھے۔ بہت سے تماشائی بھی وہاں جمع تھے۔ یہ دیکھکر میں بھی لوگوں میں جا گھسا تو معلوم ہوا کہ ایک نہایت ہی غریب بوڑھی سی عورت ہے اور چھوٹے چھوٹے کئی بچّے ہیں۔ سرکاری پیادے اس کے میاں کو پکڑے لئے جاتے تھے۔ اس واسطے کہ اُس نے کسی بنئے کے یہاں سے اُدھار کھایا تھا اور بنئے نے اُس پر ڈگری جاری کرائی تھی۔ وہ مرد مانتا تھا کہ قرضہ واجب ہے مگر کہتا تھا کہ میں کیا کروں اس وقت بالکل تہیدست ہوں۔ ہرچند اس بیچارے نے بنئے کی اور سرکاری پیادوں کی خوشامد کی مگر نہ تو بنیا مانتا تھا نہ پیادے باز آتے تھے اور پکڑے لئے جاتے تھے۔ جو لوگ وہاں کھڑے تھے اُنھوں نے بھی کہا "لالہ جہاں تم نے اتنے دنوں صبر کیا دس پانچ روز اور صبر کر جاؤ۔ بنیا بولا" اچھی کہی

میاں جی اچھی کہی۔ برسوں کا لینا اور روز کی ٹال مٹول"؟ وہ شخص جس پر ڈگری
جاری تھی غریب تو تھا۔ مگر غیرت مند بھی تھا۔ بنئے کے یہ الفاظ سُنکر غصّہ سے
سُرخ ہوگیا۔ اور گھر میں گھُس تلوار میان سے نکال چاہتا تھا کہ بنئے کا سر الگ
کر دے کہ اُس کی بیوی اُس کے پیروں میں لپٹ گئی اور رو کر کہنے لگی کہ خدا
کے لئے کیا غضب کرتے ہو۔ یہی تمہارا غصّہ ہے تو مجھ پر اور بچوں پر ہاتھ صاف
کرلو۔ تمہارے بعد تو ہمارا کہیں بھی ٹھکانا نہ رہے گا۔" ماں کو اس طرح روتے دیکھ
بچّے ایسا دھاڑ مار کر روئے کہ میرا دل ہل گیا۔ سب کے سب دوڑ کر باپ کو
لپٹ گئے۔ بچّوں کی یہ حالت دیکھکر خانصاحب کچھ ٹھنڈے ہوئے۔ اور تلوار کو
کھونٹی پر لٹکا دیا۔ اور بی بی سے کہا اچھا تو نیکبخت! پھر مجھکو اس بے غیرتی سے
بچنے کی کوئی تدبیر بتا۔" بی بی نے کہا" بلا سے جو چیز گھر میں ہے اُس کو دیکر
کسی طرح اپنا پنڈ چھڑاؤ۔ تم کسی طرح رہ جاؤ تو پھر جیسی ہوگی دیکھی جائے گی۔ توا
چکّی۔ پانی پینے کا کٹورا۔ نہیں معلوم کن وقتوں کی ہلکی ہلکی بے قلعی کی دو پتیلیاں۔
بس یہی اُس گھر کی کل کائنات تھی۔ چاندی کی دو۔ دو چوڑیاں لیکن وہ بھی
ایسی پتلی کہ جیسے تار اُس نیک بخت عورت کے ہاتھوں میں تھیں۔ یہ سب
سامان خانصاحب نے باہر لاکر اُس بنئے کے روبرو رکھدیا۔ اوّل تو بنیا

اُن چیزوں کو ہاتھ ہی نہیں لگاتا تھا۔ لوگوں نے بہت کچھ کہا سُنا۔ یہاں تک کہ اُن سرکاری سپاہیوں کو بھی رحم آیا انھوں نے بھی سمجھایا۔ بارے خدا خدا کرکے وہ اس بات پر رضامند ہوا کہ پانچ روپیہ اصل اور دو روپیہ سود ساتوں کے ساتوں دیدیں تو فارغ خطی لکھدے۔ لیکن خاں صاحب کا کل اسا سہ چار، ساڑھے چار سے زیادہ کا نہ تھا۔ تب پھر گھر میں گئے اور بی بی سے کہا کہ ڈھائی روپیہ کی کسر رہ گئی ہے بی۔ بی نے کہا کہ اب کوئی چیز بھی میرے پاس نہیں ہاں "لڑکی کے کانوں میں بالیاں ہیں۔ دیکھو جوان کو ملا کر پوری پڑے"۔

وہ لڑکی کوئی چھ برس کی تھی، بس بعینہ جیسی ہماری حمیدہ ہے، ماں جو لگی اُس کی بالیاں اتارنے تو وہ لڑکی اس حسرت کے ساتھ روئی کہ مجھ سے ضبط نہ ہوسکا۔ اور میں نے دل میں کہا کہ یا الٰہی اس وقت مجھ سے کچھ بھی اس کی مدد نہیں ہوسکتی۔ فوراً دل میں خیال آیا کہ ایک روپیہ اور کوئی دو آنہ کے پیسے تو نقد میرے پاس ہیں دیکھوں ٹوپی بک جائے تو شاید خاں صاحب کا سارا قرضہ چک جائے۔ بازار تو قریب تھا ہی۔ فوراً میں گلی کے باہر نکل آیا۔ رومال سر سے لپیٹ لیا اور ٹوپی ہاتھ میں لے ایک گوٹے والے کو دکھائی۔ اُس

نے چھ کی آنکی۔ میں نے بھی چھوٹتے ہی کہا "لا بلا سے چھ ہی دے" غرض چھ وہ اور ایک میرے پاس نقد تھا ہی۔ ساتوں روپے لے میں نے چپکے سے اُس عورت کے ہاتھ پر رکھدئے۔ تب تک پیادے خاں صاحب کو گرفتار کرکے لے جا چکے تھے، اور گھر میں رونا پیٹنا مچ رہا تھا۔ دفعتاً پورے سات روپیہ ہاتھ میں پہنچنے سے اُس عورت پر شادی مرگ کی سی کیفیت طاری ہوگئی اور اس خوشی میں اُس نے کچھ نہیں سوچا کہ یہ روپیہ کیسا ہے اور کس نے دیا ہے۔ فوراً اپنے ہمسایہ کو روپیہ دیکر دوڑایا اور خود بچوں سمیت دروازے میں آکھڑی ہوئی بات کی بات میں خانصاحب چھوٹ آئے تو بچوں کو کیسی خوشی کہ کودیں اور اچھلیں۔ کبھی باپ کے کندھے پر اور کبھی ماں کی گود میں اور کبھی ایک پر ایک۔

اب اُس عورت کو میرا خیال آیا اور بچوں سے بولی کہ کمبختو کیا اودھم مچاتے ہو۔

**عورت:۔** (میری طرف اشارہ کرکے) دعا دو اس اللہ کے بندے کی جان و مال کو جس نے آج باپ کی اور تم سب کی جانیں رکھ لیں۔ نہیں ٹکڑا بھی مانگا نہ ملتا۔ کوئی چچا یا ماموں بیٹھا تھا کہ اُس کو تمہارا درد ہوتا اور اس مصیبت کے وقت تمہاری دستگیری کرتا۔ صرف ایک باپ کے دم کا سہارا کہ اللہ رکھے ہاتھ پاؤں محنت سے۔ مزدوری سے۔ خدا کا شکر ہے روکھی

سوکھی روٹی کے روز دو وقت نہیں تو ایک ہی وقت ملے تو جاتی ہے۔ ہمارے حق
میں تو یہ لڑکا کیا ہے رحمت کا فرشتہ ہے۔ نہ جان۔ نہ پہچان۔ نہ رشتہ۔ نہ
ناتا اللہ کے بندے نے بھر مٹھی روپیہ دیکر آج ہم سب کو نئے سر سے زندہ کیا"۔
وہ بچے جس شکر گذاری کی نظر سے مجھکو دیکھتے تھے اس کی مسرت
اب تک میں اپنے دل میں پاتا ہوں۔ روپیہ خرچ کرنے کے بعد مجھے ایسی خوشی
ہوئی کہ جیسی پھر نہیں ہوئی۔ دونوں میاں بی بی کے ذہن میں اس وقت
تک یہ بات نہیں آئی تھی کہ میں نے روپیہ اُن کو دے دیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ
قرض کے طور پر دیا ہے، وہ عورت مجھکو اپنے گھر میں لے گئی اور ٹوٹی سی ایک
چوکی پڑی تھی، میں ہر چند منع کرتا رہا۔ جلدی سے اس کو اپنے دوپٹے سے
جھاڑ مجھکو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اور میاں سے بولی "کوئی تم جیسا بیخبر ہو، کھڑے
کیا ہو، جاؤ، ایک گلوری بازار سے میاں کے لئے لگوا لاؤ"۔
میں۔ نہیں۔ میں پان نہیں کھاتا۔ تکلیف مت کرو۔
عورت۔ "بیٹا! تمہاری خدمت میں اور ہم کو تکلیف۔ جی چاہتا ہے،
آنکھیں تمہارے تلووں میں بچھا دوں۔ قربان۔ اس پیاری پیاری صورت
کے نثار، اس بھولی بھولی شکل کے!! بیٹا! تم یہ بتاؤ کہ تم ہو کون؟"

ہیں۔ میری خالہ میاں صابر بخش کی سرائے میں رہتی ہیں۔"

عورت۔ پھر بیٹا۔ یہ اپنا روپیہ تم ہم سے کب لوگے؟ ہم اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ کاٹیں گے اور تمہارا قرضہ سب سے پہلے ادا کریں گے۔ مگر کام ان دنوں مندا ہے۔ دیں گے تو ہم جس طرح بن پڑیگا وہی مہینے میں مگر جہاں تم نے اتنی کی ہے للہ۔ اتنا سلوک اور کرو کہ روپیہ مہینہ لے لیا کرو۔

میں۔ "آپ یہ روپیہ ادا کرنے کی کچھ فکر نہ کیجئے۔ میں نے روپیہ لینے کی نیت سے نہیں دیا ہے۔"

یہ سن کر تمام خاندان کا خاندان اتنا خوش ہوا کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ میں اُن میں اس وقت کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ جیسے خوشدل اور شکر گذار رعایا میں کوئی بادشاہ۔ اُس عورت کے منہ سے مارے خوشی اور شکر گذاری کے بات نہیں نکلتی تھی۔ بار بار میری بلائیں لیتی تھی اور میرے ہاتھوں کو چومتی تھی اور ہاتھوں سے لگاتی تھی۔ اُسی کی بلاؤں میں رومال سر پر سے کھسک گیا تو اُس نے دیکھا کہ میرے سر پر ٹوپی نہیں پوچھا تو مجھ کو کہنا پڑا کہ وہی ٹوپی بیچکر میں نے روپیہ دیا تھا۔ یہ سنکر اُس نے مجھکو سیکڑوں ہزاروں دعائیں دیں۔ اتنی احسان مندی کے اظہار پر میں اُلٹا اُسی کا ممنون ہوا۔

جسقدر خوشامد کرتی تھی میں زمین میں گڑا جاتا تھا۔ غرض میں وہاں سے رخصت
ہوا تو ٹوپی نہ ہونے کی وجہ سے سیدھا گھر لوٹ آیا"

عین گلی میں بھائی جان سے ملاقات ہوئی۔ اُنہوں نے میری ہیئت دیکھکر
تعجب کیا اور بولے "ایں! ٹوپی کے بدلے چنے کھائے" میں نے کچھ جواب نہیں
دیا۔ اس واسطے کہ مجھکو اُس بات کا ظاہر کرنا منظور نہ تھا"

"اُسی شام کو بھائی جان سے اور امّاں جان سے کچھ روپیہ کے بارہ میں تکرار
ہوئی" امّاں جان نے اُنہیں چٹورا کہا۔ بھائی جان نے جواب دیا کہ میں چٹورا
نہیں ہوں۔ چٹورے تمہارے منجھلے صاحبزادے ہیں جن کو تم بڑا مولوی سمجھتی
ہو۔ وہ سر کی ٹوپی تک بیچکر کھا گئے۔ اماں جان نے مجھکو بلا کر پوچھا"

میں۔ "اگر بیچکر کھانا ثابت ہو جائے تو جو چور کی سزا وہ میری سزا۔

اماں جان۔ پھر کیا کہیں کھو دی؟

میں۔ "کھوئی بھی نہیں"

اماں جان بھائی تو تو عجب تماشے کا لڑکا ہے بیچی نہیں۔ کھوئی نہیں پھر ٹوپی
گئی تو کہاں گئی۔!"

میں۔ اگر آپ کو میری بات کا اعتبار ہے تو بس سمجھ لیجئے کہ میں نے کہیں اُس

کو بیجا طور پر صرف نہیں کیا ہے"

اماں جان۔ اگر یہی تمہارے بچپن ہیں تو تم نے پڑھ لکھ کر ڈبو دیا"

"میں اس وقت عجیب مشکل میں تھا۔ ظاہر کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا اور بے ظاہر کئے بن نہیں پڑتی تھی۔ مگر مجھ کو یقین تھا کہ جب میرا معاملہ پاک صاف ہے تو گو بالفعل بھائی جان کے کہنے اور میرے چپ رہنے سے اماں جان کو ایک بدگمانی سی ہو گئی لیکن کبھی نہ کبھی ضرور ان کے دل سے خدشہ دفع ہو ہی جائیگا اور کچھ نہ سہی تو اتنا تو سمجھ ہی لیں گی کہ بیٹا بدراہ نہیں ہے۔ نہیں معلوم ٹوپی کا کیا بھید ہے"

سو خدا کی قدرت ایک ہفتہ بھی نہیں گذرا تھا کہ صالحہ بیمار پڑی اور اماں جان اس کی عیادت کو گئیں میں ان کے ساتھ تھا۔ ابھی اماں جان سواری سے نہیں اتری تھیں کہ ادھر سے وہی خاں صاحب چلے آرہے تھے مجھ کو دیکھ کر دور ہی سے دعائیں دینے لگے اور ایسے تپاک اور دلسوزی کے ساتھ میری خیر و عافیت پوچھی کہ جیسے کوئی اپنا بزرگ یا عزیز دریافت حال کرتا ہو میں نے مناسب حالت جواب دیا اماں جان۔ آخر یہ سب باتیں پردے کے اندر بیٹھی ہوئی سن رہی تھیں۔ اترتے کے ساتھ ہی مجھ سے پوچھا۔

اماں جان۔ "علیم! یہ کون شخص تھا جو تم سے باتیں کر رہا تھا۔؟"

میں۔ یہ ایک خانصاحب ہیں جو میاں مسکین کے کوچے میں رہتے ہیں۔ بس میں اسی قدر جانتا ہوں۔"

اماں جان۔ "لیکن باتیں تو تم سے ایسے گرویدہ ہو ہو کر کرتے تھے گویا برسوں کی جان پہچان ہو۔"

میں۔ نہیں شاید ان کو میرا نام بھی معلوم نہیں۔

اماں جان۔ "پھر تمہارے ساتھ ایسے خلوص سے کیوں پیش آئے۔"

میں بعض لوگوں کا دستور ہوتا ہے کہ ذرا سے تعارف میں بھی بڑے تپاک کے ساتھ پیش آیا کرتے ہیں۔"

اگرچہ اماں جان کو میرے جواب سے تشفی نہیں ہوئی مگر اُن کو اندر جانے کی جلدی تھی چلی گئیں۔ خاں صاحب نے کہیں اپنے گھر میں میرا تذکرہ کیا۔ میں تو گھر چلا آیا۔ مگر شاید اُن کی بیوی اماں جان کے پاس گئیں اور میرے اس ٹوپی بیچنے اور روپیہ دینے کا تمام حال بیان کیا۔

جب اماں جان واپس آئیں تو مجھ سے کہنے لگیں "علیم! ہم نے تمہاری چوری پکڑی پہ پکڑی۔"

میں۔ (حیران ہوکر) میری چوری ہا اماں جان ؟۔

اماں جان۔ "جی ہاں چوری!

میں۔ بھلا میں بھی سنوں۔

اماں جان۔ تم پہلے ٹوپی کا ماجرا بتا لو تب مجھ سے اپنی چوری کی حقیقت سنو۔
اتنا کہنے سے میں سمجھ گیا اور ہنس کر چپ ہو رہا۔

× × × × × × × × × × × × × × × × × × × × × × × × ×

نصوح۔ بے شک جتنی باتیں تم نے بیان کیں وہ داخلِ ہمدردی ہیں خصوصاً یہ خاں صاحب کا قصہ تو ہمدردی کی ایک اعلیٰ درجہ کی مثال ہے۔ تم نے آج مجھکو مطمئن کر دیا۔ خدا تم کو دنیا اور دین دونوں میں سرخرو رکھے۔
اچھا اب جاؤ۔ اپنا کام کرو۔

(مولانا نذیر احمد)

---

# مرغِ اسیر اور صیّاد

اک مرغ ہوا اسیرِ صیّاد دانا تھا وہ طائرِ چمن زاد
بولا جب اس نے باندھے بازو کھلتا نہیں کس طمع پہ ہے تو

بیچا تو ٹکے کا جانور ہوں      گر ذبح کیا تو مشت پر ہوں
پالا۔ تو مفارقت ہے انجام      دانا ہے تو مجھ سے لے مرے دام
بازو میں نہ تو مرے گرہ باندھ      سمجھاؤں جو پند اُسے گرہ باندھ
سُن کوئی ہزار کچھ سُنائے      کیجے وہی جو سمجھ میں آئے
قابو ہو تو کیجئے نہ غفلت      عاجز ہو تو ہاریئے نہ ہمت
آتا ہو تو ہاتھ سے نہ دیجے      جاتا ہو تو اس کا غم نہ کیجے
طائر کے یہ سُن کلام صیاد      بن دام ہوا غلام صیاد
بازو کے جو بند کھول ڈالے      طائر نے تڑپ کے پر نکالے
اک شاخ پہ جا۔ چہک کے بولا      کیوں پر مرا کیا سمجھ کے کھولا
ہمت نے مری تجھے اُڑایا      غفلت نے تری تجھے چھڑایا
دولت نہ نصیب میں تھی تیرے      تھا لعل نہاں شکم میں میرے
دے کر صیاد نے دلاسا      چاہا۔ پھر مجھے لگائے لاسا
بولا وہ کہ دیکھ کیا کیا جہل      طائر بھی کہیں نگلتے ہیں لعل

ارباب غرض کی بات سُنکر
کر لیجئے ایک بیک نہ باور      (نسیم لکھنوی)

# "عزّت"

اکثر لوگ دولت کو عزت کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ مگر ایسا سمجھنا بڑی غلطی ہے دولت بلاشبہ اس بات کا ذریعہ ہے کہ چند خوشامدی اور کمینہ خصلت خوشامد کے لئے اور جھوٹی تعریف کرنے اور جھوٹی عزت دینے اور جھوٹی دوستی جتانے کو موجود ہو جاتے ہیں۔ اور جب تک وہ ہے یہ بھی حاضر ہیں اور وہ نہیں تو یہ بھی غائب۔

عزت خود ایک صفت ہے جو مثل اور صفتوں کے خود انسان کی ذات میں ہوتی ہے۔ سب سے پہلے خود انسان اپنے آپ کو معزز سمجھتا ہے۔ اس خیال کی بدولت اس کا دل نہایت قوی اور نہایت خوش رہتا ہے وہ مطلق اس بات کی خواہش نہیں رکھتا کہ کوئی دوسرا اس کی عزت کرے بلکہ اس کی خوشی اس میں ہوتی ہے کہ وہ خود ایسا ہو کہ آپ اپنی عزت پر یقین کرے۔ جب انسان ایسا ہو جاتا ہے تو تمام دنیا خود اس کی عزت کرتی ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ لوگ میری عزت کریں مگر بے اختیار دوست دشمن اس کے آگے جھکتے ہیں۔

افسوس کہ اس زمانے کے لوگ قبل اس کے کہ وہ خود اپنی عزت پر آپ یقین کریں دوسروں سے اور خصوصاً اس معزز تربیت یافتہ قوم سے جس کو خدا نے اپنی بڑی حکمت سے ہمارے ساتھ ہندوستان میں بسایا ہو اپنی عزت کے خواہاں ہوتے ہیں، اس لئے اپنے مقصد کو نہیں پہنچتے۔

اس کے ساتھ ایک بڑا افسوس یہ ہو کہ ہمارے زمانے کے لوگوں نے عزت کے معنی سمجھنے میں بھی بڑی غلطی کی ہے انہوں نے عزت کے مفہوم کو چند ظاہری باتوں پر منحصر سمجھ رکھا ہے۔ خانگی امور میں تو اُنھوں نے اپنی عزت اس میں سمجھ رکھی ہو کہ دو چار خدمت گار دست بستہ اُن کے سامنے کھڑے ہیں، حضور و جناب عالی کہکر اور ہاتھ جوڑ کر کچھ بات عرض کرتے ہیں۔ سواری کے جلوس میں دو چار عصا بردار دوڑتے ہیں۔ دو تین خواص پان کا ڈبہ اور ایک پیک تھوکنے کا پیکدان لئے حاضر ہیں۔

برادری میں اور اپنی قوم میں اپنی عزت اس میں سمجھ رکھی ہو کہ بیٹے کی بسم اللہ اور بیٹے کی شادی میں وہ کچھ کیا کہ آج تک کسی نے ویسا نہیں کیا تھا۔ کوئی دوست نہیں رہا جو نہ بلایا گیا ہو کوئی رقاصہ نہیں رہی جو مجرے کو نہ آئی ہو بھانڈ ہو لیسے ایسا سماں باندھا کہ کسی کے یہاں نہ بندھا ہو۔ حاکموں

کے دربار کی عزت اس پر منحصر ہے کہ صاحب ہم سے آج ہنسکر بولے۔ یہ عزت حقیقی عزت نہیں ہے بلکہ نیک افعال اور پسندیدہ اطوار سے لوگوں کے دلوں میں خود بخود جو وقعت و عظمت بیٹھتی ہے وہی حقیقی عزت ہے۔ جھوٹی عزت چونکہ دل سے نہیں کی جاتی اس لئے اس کو قیام نہیں ہوتا۔ جن اسباب سے ایسی عزت حاصل ہوتی ہے اُن کے زائل ہوتے ہی وہ بھی جاتی رہتی ہے۔ حقیقی عزت کی جگہ دل میں ہوتی ہے اور چونکہ ان کے اسباب قوی ہوتے ہیں اس لئے اس کا قیام زندگی بھر کیا دوام کے لئے ہوتا ہے۔ نیک اور اچھے لوگ مر بھی جاتے ہیں تو خاص و عام اُن کے نام کی عزت کرتے ہیں۔

(سر سید)

---

# خوشا وقتِ شام

خدا کی نظر آ رہی شان ہے　　سہانا سا اک سبز میدان ہے

ہوا سے جو سبزہ ہے لہرا رہا　　تو ہے دیکھنے سے مزہ آ رہا

ہری گھاس وہ لہلہاتی ہوئی　　ہوا لوٹ کر لہرکھاتی ہوئی

وہیں ایک پہلو میں تالاب ہے　　کہ دن دھوپ اور رات مہتاب ہے

یہ سبزی اسی کے سہارے پہ ہے — درختوں کی جھرمٹ کنارے پہ ہے
لبِ آب جو ہیں شجر جھومتے — وہ ہیں جھک کے پانی کا منہ چومتے
سماں آج کل ہے گا برسات کا — مزا دن کا ہے لطف ہے رات کا
درخت اک جگہ ہیں جو چھائے ہوئے — ہوا وار بنگلے بنائے ہوئے
تو اک چھوٹے لڑکے نے واں آنکر — جگہ خوب موقعے کی پہچانکر
رکھا سامنے اپنے جزدان ہے — ورق پر لگائے ہوئے دھیان ہے
خدا جانے ہے ہاتھ میں کیا کتاب — کہ اس میں ہے ڈوبا جو ماہی در آب
اور آتی ہے جوں جوں سیاہی شام — وہ شوقین لڑکا بذوق تمام
جھکا جاتا ہے سر اس طرح غور سے — کہ کاغذ میں کیڑا ہو جس طور سے
نظر اس کی جب تھرانے لگی — سیہ شام سرمہ اڑانے لگی
بہت بیٹھا بیٹھا جو تھا تھک گیا — اک انگڑائی لیکر وہ لڑکا اٹھا
ملا کر باہم چھوٹے چھوٹے سے ہاتھ — ملے چہرہ پر لطفِ محنت کے ساتھ

رکھا پھر کتابوں کو جزدان میں
ٹہلنے لگا آکے میدان میں

لگی ٹھنڈی ٹھنڈی جو منہ پر ہوا — حواس اس کے آئے ٹھکانے ذرا

تھے دن کے تھکے ماندے جو جانور　　وہ اپنے مقاموں پہ سب آن کر

بہم ملکے آوازیں دینے لگے　　بسیرے درختوں پہ لینے لگے

وہ مل جلکے آپس میں تھے بولتے　　کہ اپنی خوش آوازیاں تولتے

درختوں پہ چڑیوں کی چوں چوں کہو　　جو سمجھو تو پھر یادِ بچوں کہو

جو سبزے میں جھینگر تھے برسات کے　　دیئے چھیڑ اُنھوں نے بھی سُر رات کے

کئی غول طوطوں کے جھنکارتے　　گئے سبز سبز ایسے بل مارتے

تھا لڑکا بھی حیراں یہ کیا ہوگیا　　کہ میداں کا سبزہ ہوا ہوگیا

کیا خاتمہ دن کا جب شام نے　　تو لی گھر کی راہ اس خوش انجام نے

اِدھر اور اُدھر کو نظر ڈالتا　　چلا جاتا تھا دیکھتا بھالتا

کچھ گائیں بھینسیں ملیں راہ میں　　پھریں کھیت سے گھر کی تھیں چاہ میں

ٹپکتی خوشی صورتِ حال سے　　عجب جا رہی تھیں لٹک چال سے

بھرے دودھ سے تھن لٹکتے ہوئے　　کہ مشکیزے جیسے چھلکتے ہوئے

کئی ساتھ ساتھ ان کے گوسالے تھے　　کہ ماؤں نے تھن کے تلے پالے تھے

اور اک گلہ باں پیچھے آتا ہوا　　تھا الغوزہ اپنا بجاتا ہوا

ملی راہ میں اس کو کچھ بکریاں　　اور اک بوک بکرا رواں درمیاں

وہ دو دو دل نہائی تھیں یوں چلی　　کہ دن بھر تھیں جو چگ کے گھر کو چلی

پھلواسے بچے اچھالتے ہوئے — تھے اٹکھیلیوں سے مچلتے ہوئے

محبت سے ممیاتا جاتا کوئی
بہت تھک کے ماں کو بلاتا کوئی

وہ لڑکا جو پہنچا بنزدیک شہر — نظر آئی یاں اور ہی لہر بہر
دکانوں پہ روشن سراسر چراغ — چراغوں نے گویا لگائے تھے باغ
تصاویر و نقشوں سے گلزار گھر — طرحدار کمرے ہوا دار گھر
کہیں مل کے بیٹھے ہیں کوٹھے پہ یار — گہے شعر خوانی ہی گاہے ستار
غزل ریختے کی ہے گاتا کوئی — ہو گاتا کوئی اور بجاتا کوئی

لطیفوں پہ اڑتے ہیں جو قہقہے
کہاں یاد بلبل کو یہ چہچہے

غرض ہر جگہ سے گزرتا ہوا — تماشے خدائی کے کرتا ہوا
گیا جب کہ گھر میں وہ روشن چراغ — تو ماں باپ بھی ہو گئے باغ باغ
خوشی سے نہ جامے میں پھولے سمائے — بہن بھائی بولے وہ آئے وہ آئے
سلام اس نے پہلے کیا باپ کو — جھکایا بحسن ادب آپ کو

دعا دی یہ اس نے بھی لے کر سلام
مبارک مبارک خوشا وقت شام

آزاد

# خوشامد

دل کی جسقدر بیماریاں ہیں ان میں سب سے زیادہ مہلک خوشامد کا اچھا لگنا ہے جس وقت کہ انسان کے بدن میں ایسا مادّہ پیدا ہو جاتا ہے جو وبائی ہوا کے اثر کو جلد قبول کر لیتا ہے تو اسی وقت انسان مرضِ مہلک میں گرفتار ہو جاتا ہے اسی طرح جبکہ خوشامد کے اچھا لگنے کی بیماری انسان کو لگ جاتی ہے تو اس کے دل میں ایسا مادّہ پیدا ہو جاتا ہے جو ہمیشہ زہریلی باتوں کے زہر کو چوس لینے کی خواہش رکھتا ہے جس طرح کہ خوش گلو گانے والے کا راگ اور خوش آیند باجے کی آواز انسان کے دل کو نرم کر دیتی ہے اسی طرح خوشامد بھی انسان کے دل کو ایسا پگھلا دیتی ہے کہ ہر ایک کانٹے کے چبھنے کی جگہ اس میں ہو جاتی ہے۔

اول اول یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنی آپ خوشامد کر کر اپنے دل کو خوش کرتے ہیں پھر رفتہ رفتہ اوروں کی خوشامد ہم میں اثر کرنے لگتی ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اوّل تو خود ہم کو اپنی محبت پیدا ہوتی ہے پھر یہی محبت ہم سے باغی ہو جاتی ہے اور ہمارے بیرونی دشمنوں سے جا ملتی ہے اور جو محبت و مہربانی ہم خود اپنے ساتھ کرتے تھے وہ خوشامدیوں کے ساتھ کرنے لگتے ہیں اور وہی ہماری محبت ہم کو یہ بتلاتی ہے کہ ان خوشامدیوں پر مہربانی کرنا نہایت نیکی اور انصاف ہے جو ہماری باتوں کو ایسا سمجھتے ہیں اور اُن کی اسقدر قدر کرتے

ہیں جب کہ ہمارا دل ایسا نرم ہوجاتا ہی اور اس قسم کے پھسلاوے اور فریب میں آجاتا ہی تو ہماری عقل خوشامدیوں کے مکروفریب سے اندھی ہوجاتی ہی اور وہ مکروفریب ہماری ہماری طبیعت پر بالکل غالب آجاتا ہی۔

لیکن اگر ہر شخص کو یہ بات معلوم ہوجائے کہ خوشامد کا شوق کیسے نالایق اور کمینہ سببوں سے پیدا ہوتا ہی تو یقینی خوشامد کی خواہش کرنے والا شخص بھی ویسا ہی نالایق اور کمینہ متصور ہونے لگے گا جبکہ ہم کو کسی ایسے وصف کا شوق پیدا ہوتا ہی جو ہم میں نہیں ہی یا ہم ایسا بننا چاہتے ہیں جیسے کہ درحقیقت ہم نہیں ہیں تب ہم اپنے تئیں خوشامدیوں کے حوالے کرتے ہیں جو اوروں کے اوصاف اور اوروں کی خوبیاں ہم میں لگانے لگتے ہیں۔ گو بسبب اس کمینہ شوق کے اس خوشامدی کی باتیں ہم کو اچھی لگتی ہوں مگر درحقیقت وہ ہم کو ایسی ہی بدزیب ہیں کہ دوسروں کے کپڑے جو ہمارے بدن پر کسی طرح ٹھیک نہیں۔ اس بات سے کہ ہم اپنی حقیقت کو چھوڑ کر دوسروں کے اوصاف اپنے میں سمجھنے لگیں یہ بات نہایت عمدہ ہی کہ ہم خود اپنی حقیقت کو درست کریں اور سچ مچ وہ اوصاف خود اپنے میں پیدا کریں اور بعوض جھوٹی نقل بننے کے خود ایک اچھی اصل ہوجائیں کیونکہ ہر قسم کی طبیعتیں جو انسان رکھتے ہیں اپنے اپنے موقع پر مفید ہوسکتی ہیں، ایک تیز مزاج اور چست و چالاک آدمی اپنے موقع پر ایسا ہی مفید ہوتا ہی جیسے کہ ایک رونی صورت کا چپ چاپ آدمی اپنے موقع پر۔

خودی جو انسان کو برباد کرنے والی چیز ہی جب چپ چاپ سے پی ہوئی ہوتی ہی تو خوشامد اس کو جگاتی اور ابھارتی ہی اور جس کی خوشامد کی جاتی ہی اس میں چھچھورے پن کی کافی لیاقت

پیدا کر دیتی ہے۔ مگر یہ بات بخوبی یاد رکھنی چاہیئے کہ جس طرح خوشامد ایک بدتر چیز ہے اس طرح مناسب اور سچی تعریف کرنا نہایت عمدہ اور بہت ہی خوب چیز ہے جس طرح کہ لایق شاعر دوسروں کی تعریف کرتے ہیں کہ ان اشعار سے ان لوگوں کا نام باقی رہتا ہے جن کی وہ تعریف کرتے ہیں اور شاعری کی خوبی سے خود ان شاعروں کا نام بھی دنیا میں باقی رہتا ہے۔ دونوں شخص خوش ہوتے ہیں۔ ایک اپنی لیاقت کے سبب سے اور دوسرا اس لیاقت کو تمیز کرنے کے سبب سے مگر لیاقت شاعری کی یہ ہے کہ وہ نہایت بڑے اُستاد مصوّر کی مانند ہو کر وہ اصل صورت اور رنگ اور خال و خط کو بھی قایم رکھتا ہے اور پھر بھی تصویر ایسی بناتا ہے کہ خوشنما معلوم ہوتی ہے۔

ایشیا کے شاعروں میں ایک بڑا نقص یہی ہے کہ وہ اس بات کا خیال نہیں رکھتے کہ جسکی تعریف کرتے ہیں اُسکے اوصاف ایسے جھوٹے اور ناممکن بیان کرتے ہیں جن کے سبب سے وہ تعریف نہیں رہتی بلکہ فرضی خیالات ہو جاتے ہیں۔

ناموری کی مثال نہایت عمدہ خوشبو کی ہے، جب ہوشیاری اور سچائی سے ہماری واجب تعریف ہوتی ہے تو اُس کا ویسا ہی اثر ہوتا ہے جیسے عمدہ خوشبو کا۔ مگر جب کسی کمزور دماغ میں زبردستی سے وہ خوشبو ٹھونس دی جاتی ہے تو ایک تیز بو کی مانند دماغ کو پریشان کر دیتی ہے۔ فیاض آدمی کو بدنامی اور نیک نامی کا زیادہ خیال ہوتا ہے اور جب عالی ہمت طبیعت کو مناسب عزت اور تعریف سے ایسی ہی تقویت ہوتی ہے جیسے کہ غفلت اور حقارت سے پست ہمتی ہوتی ہے۔ جو لوگ عوام کے درجہ سے اوپر ہیں اُنہیں لوگوں پر

اس کا اثر زیادہ ہوتا ہے جیسے کہ تھرمامیٹر میں وہی حصہ موسم کا زیادہ اثر قبول کرتا ہے جو صاف اور سب سے اوپر ہوتا ہے۔ (سرسید)

# ہمدردِ قوم

ہے کوئی اپنی قوم کا ہمدرد — نوعِ انساں کا جس کو سمجھیں فرد
قوم پر زد نہ کوئی دیکھ سکے — قوم کا حالِ بد نہ دیکھ سکے
قوم سے جان تک عزیز نہ ہو — قوم سے بڑھ کے کوئی چیز نہ ہو
سمجھے اُنکی خوشی کو راحتِ جاں — واں جو نوروز ہو تو عید ہو یاں
رنج کو ان کے سمجھے مایۂ غم — واں اگر سوگ ہو تو یاں ماتم
قوم کی خاطر اُنکے ہیں سب کام — خواہ ان میں سفر ہو خواہ مقام
سیکڑوں گل رُخ اور مہ پارے — لاڈلے ماں کے باپ کے پیارے
جان اپنی لئے ہتیلی پر — کرتے پھرتے ہیں بحر و بر کے سفر
شوق یہ ہے کہ جان جائے تو جائے — پر کوئی بات کام کی ہاتھ آئے
جس سے مشکل ہو کوئی قوم کی حل — ملک کا آئے کوئی کام نکل
کھپ گئے کتنے بن کے جھاڑوں میں — مر گئے سیکڑوں پہاڑوں میں
لکھے جب تک جئے، سفر نامے — چل دیئے ہاتھ میں قلم تھامے
گو سفر میں اٹھائے رنج کمال — کر دیا پر وطن کو نہال

(حالیؔ)

تمام شد